

افسانہ

اردو میں افسانے کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کے شروع میں ہوا۔ ناول کی طرح اس صنف پر بھی مغربی ادب کا گہرا اثر ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ دینے اور مصروف رہنے والوں کے لیے مختصر افسانہ، ناول اور داستان سے زیادہ کشش رکھتا ہے۔

مختلف نقادوں نے افسانے کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں۔ ایک نقاد نے کہا ہے کہ افسانہ ایسی نثری کہانی ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جاسکے۔ ایک اور نقاد کا قول ہے کہ افسانے میں بنیادی چیز وحدتِ تاثر ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ افسانے کی شکل بھی تبدیل ہوئی ہے۔

ایک اچھا افسانہ اختصار کے ساتھ زندگی کے کسی گوشے کو قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ مختصر ہونے کی وجہ سے کہانی میں جھول پیدا ہونے کا اندیشہ بھی کم ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کا مشاہدہ اور انسانی نفسیات کا مطالعہ گہرا ہونا چاہیے۔ کردار اور واقعات ایسے ہوں جو ہماری زندگی اور ہمارے تجربوں سے مطابقت رکھے ہوں۔

اردو کے افسانہ نگاروں میں پریم چند، علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، غلام عباس، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین بہت اہم ہیں۔

پریم چند

(1880ء - 1936ء)



منشی پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ انھوں نے نواب رائے کے نام سے کچھ افسانے لکھے، پھر 1910ء میں پریم چند نام اختیار کیا اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔ وہ بنارس کے قریب ایک گاؤں لمبی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی عجائب لال ڈاک کے محکمہ میں کلرک تھے۔ پریم چند آٹھ سال کے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ جب وہ پندرہ سال کے ہوئے تو ان کے باپ نے ان کی شادی کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں انٹر پاس کرنے کے بعد اپنی تعلیم چھوڑ دینی پڑی۔ انھوں نے محکمہ تعلیم میں نوکری کر لی۔ سرکاری ملازمت کی وجہ سے حق بات کے اظہار میں رکاوٹ محسوس ہوئی تو ملازمت ترک کر کے ساری زندگی تصنیف و تالیف کے کاموں میں صرف کر دی۔

پریم چند نے تقریباً ساڑھے تین سو افسانے اور بارہ ناول لکھے۔ انھیں اردو افسانے کا موجد نہیں تو پہلا بڑا افسانہ نگار ضرور کہا جاسکتا ہے اور اکثر لوگوں کے خیال میں وہ اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار بھی ہیں۔ انھوں نے مختصر افسانے کو ایک معیار عطا کیا۔ ان کے افسانے اور ناول اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ ان کے مجموعوں میں 'واردات'، 'پریم چنسی'، 'پریم بتیسی'، 'آخری تحفہ'، 'نجات' اور 'زادراہ' قابل ذکر ہیں اور ان کے ناولوں میں 'چوگانِ ہستی'، 'میدانِ عمل'، 'بیوہ'، 'بازارِ حسن' اور 'گودان' ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

پریم چند کے ناول اور افسانے بے مثل حقیقت نگاری کا نمونہ ہیں۔ ان کے افسانوں کا پس منظر مشرقی یوپی کا دیہات ہے۔ ہندوستانی کسان اپنی پوری شخصیت کے ساتھ پریم چند کی تصانیف میں نظر آتا ہے۔ پریم چند کی نثر سادہ اور آسان ہے۔ اپنے اندازِ بیان سے انھوں نے افسانوں کو بہت پُر لطف بنا دیا ہے۔



4914CH03

حج اکبر

منشی صابر حسین کی آمدنی کم تھی اور خرچ زیادہ، اپنے بچہ کے لیے دایہ رکھنا گوارا نہیں کر سکتے تھے، لیکن ایک تو بچہ کی صحت کی فکر اور دوسرے اپنے برابر والوں سے بیٹے بن کر رہنے کی ذلت اس خرچ کو برداشت کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ بچہ دایہ کو بہت چاہتا تھا۔ ہر دم اس کے گلے کا ہار بنا رہتا تھا۔ اس وجہ سے دایہ اور بھی ضروری معلوم ہوتی تھی۔ مگر شاید سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ مروت کے باعث دایہ کو جواب دینے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ بڑھیا ان کے یہاں تین سال سے نوکرتھی۔ اس نے ان کے اکلوتے بچے کی پرورش کی تھی۔ اپنا کام دل و جان سے کرتی تھی۔ اسے نکالنے کا کوئی حیلہ نہ تھا اور خواہ مخواہ کیڑے نکالنا صابر جیسے حلیم شخص کے لیے غیر ممکن تھا۔ مگر شاید اس معاملہ میں اپنے شوہر سے متفق نہ تھی۔ اسے شک تھا کہ دایہ ہم کو لوٹے لیتی ہے۔ جب دایہ بازار سے لوٹی تو وہ دلیز میں چھپی رہتی کہ دیکھوں آٹا چھپا کر تو نہیں رکھ دیتی۔ لکڑی تو نہیں چھپا دیتی۔ اس کی لائی ہوئی ہر چیز کو گھنٹوں دیکھتی — بار بار پوچھتی اتنا ہی کیوں؟ کیا بھاؤ ہے؟ کیا اتنا مہنگا ہو گیا؟ دایہ کبھی تو ان بدگمانیوں کا جواب ملائمیت سے دیتی۔ لیکن جب بیگم زیادہ تیز ہو جاتیں تو وہ بھی کڑی پڑ جاتی تھی۔ قسمیں کھاتی۔ صفائی کی شہادتیں پیش کرتی۔ تردید اور جھٹ میں گھنٹوں لگ جاتے۔ قریب قریب روزانہ یہی کیفیت رہتی تھی اور روز یہ ڈراما دایہ کی خفیف سی اشک ریزی کے بعد ختم ہو جاتا تھا۔ دایہ کا اتنی سختیاں جھیل کر پڑے رہنا شاید کہ کے شکوک کی آبیاری کرتا تھا۔ اسے کبھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ بڑھیا محض بچے کی محبت سے پڑی ہوئی ہے۔ وہ دایہ کو ایسے لطیف جذبہ کا اہل نہیں سمجھتی تھی۔ اتفاق سے ایک روز دایہ کو بازار سے لوٹنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ وہاں دو بچہ نونوں میں بڑے جوش و خروش سے مناظرہ تھا۔ ان کا مصوٰطرزادہ، ان کا اشتعال انگیز استدلال، ان کی مشکل

تضحیک، ان کی روشن شہادتیں اور منور روایتیں، ان کی تعریض اور تردید بے مثال تھیں۔ زہر کے دودر یا تھے یا دوشعلے جو دونوں طرف سے اٹک کر باہم گتے گئے تھے۔ کیا روانی زبان تھی! گویا کوزے میں دریا بھرا ہو۔ ان کا جوش اظہار ایک دوسرے کے بیانات کو سننے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ ان کے الفاظ کی ایسی رنگینی، تخیل کی ایسی نوعیت، اسلوب کی ایسی جدت، مضامین کی ایسی آمد، تشبیہات کی ایسی موزونیت اور فکر کی ایسی پرواز پر ایسا کون سا شاعر ہے جو رشک نہ کرتا۔ صفت یہ تھی کہ اس مباحثہ میں تلخی یا دلاویزی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ دونوں بلبلیں اپنے اپنے ترانوں میں محو تھیں۔ ان کی متانت، ان کا ضبط، ان کا اطمینان قلب حیرت انگیز تھا۔ ان کے ظرف دل میں اس سے کہیں زیادہ کہنے کی اور بدرجہا زیادہ سننے کی گنجائش معلوم ہوتی تھی۔ الغرض یہ خالص دماغی ذہنی مناظرہ تھا۔ اپنے اپنے کمالات کے اظہار کے لیے ایک خالص زور آزمائی تھی اپنے اپنے کرتب اور فن کے جوہر دکھانے کے لیے۔

تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ وہ مبتدل کنایات و اشارے جن پر بے شرمی کو شرم آتی اور کلماتِ ریک جن سے عفونت بھی دور بھاگتی، ہزاروں رنگین مزاجوں کے لیے محض باعثِ تفریح تھے۔ دایہ بھی کھڑی ہو گئی کہ دیکھوں کیا ماجرا ہے، پر تماشا اتنا دلاویز تھا کہ اسے وقت کا مطلق احساس نہ ہوا۔ یکا یک نوجبے کی آواز کان میں آئی تو سحر ٹوٹا۔ وہ لپکی ہوئی گھر کی طرف چلی۔ شاکرہ بھری بیٹھی تھی۔ دایہ کو دیکھتے ہی تیور بدل کر بولی — ”کیا بازار میں کھو گئی تھیں؟ دایہ نے خطاوارانہ انداز سے سر جھک لیا اور بولی ”بیوی ایک جان پہچان کی ماما سے ملاقات ہو گئی اور باتیں کرنے لگی۔“

شاکرہ جواب سے اور بھی برہم ہوئی۔ یہاں دفتر جانے کو دیر ہو رہی ہے تمہیں سیر سپاٹے کی سوچھی ہے۔ مگر دایہ نے اس وقت دبے میں خیریت سمجھی۔ بچہ گو گو د میں لینے چلی۔ پر شاکرہ نے جھڑک کر کہا۔ ”رہنے دو۔ تمہارے بغیر بے حال نہیں ہوا جاتا۔“

دایہ نے اس حکم کی تعمیل ضروری نہ سمجھی بیگم صاحبہ کا غصہ فرو کرنے کی اس سے زیادہ کارگر

کوئی تدبیر ذہن میں نہ آئی۔ اس نے نصیر کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف چلا۔ دایہ نے اسے گود میں اٹھالیا۔ اور دروازہ کی طرف چلی لیکن شاکرہ باز کی طرح جھپٹی اور نصیر کو اس کی گود سے چھین کر بولی۔ ”تمہارا یہ مکر بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ یہ تمنا شے کسی اور کو دکھائیے۔ یہاں طبیعت سیر ہوگئی۔“

دایہ نصیر پر جان دیتی تھی اور سمجھتی تھی کہ شاکرہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ اس کی سمجھ میں شاکرہ اور اس کے درمیان یہ ایسا مضبوط تعلق تھا جسے معمولی ترشیاں کمزور نہ کر سکتی تھیں۔ اسی وجہ سے باوجود شاکرہ کی سخت زبانیوں کے اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ واقعی مجھے نکالنے پر آمادہ ہے۔ پر شاکرہ نے یہ باتیں کچھ اس بے رخی سے کہیں اور بالخصوص نصیر کو اس بے دردی سے چھین لیا کہ دایہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ بولی۔ ”بیوی مجھ سے کوئی ایسی بڑی خطا تو نہیں ہوئی۔ بہت ہوگا تو پاؤ گھنٹہ کی دیر ہوئی ہوگی۔ اس پر آپ اتنا جھلا رہی ہیں۔ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ دوسرا دروازہ دیکھو۔ اللہ نے پیدا کیا ہے تو رزق بھی دے گا۔ مزدوری کا کال تھوڑا ہی ہے۔“

شاکرہ: ”تو یہاں تمہاری کون پروا کرتا ہے۔ تمہاری جیسی ماماں گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔“

دایہ: ”ہاں خدا آپ کو سلامت رکھے۔ ماماں، دایاں بہت ملیں گی۔ جو کچھ خطا ہوئی ہو۔ معاف کیجیے گا۔ میں جاتی ہوں۔“

شاکرہ: ”جا کر مردانے میں اپنی تنخواہ کا حساب کرلو۔“

دایہ: ”میری طرف سے نصیر میاں کو اس کی مٹھائیاں منگوادیتے ہیں۔“

اتنے میں صابر حسین بھی باہر سے آگئے۔ پوچھا۔ ”کیا ہے؟“

دایہ: ”کچھ نہیں۔ بیوی نے جواب دے دیا ہے۔ گھر جاتی ہوں۔“

صابر حسین خانگی تر دات سے یوں بچتے تھے جیسے کوئی برہنہ پا کانٹوں سے بچے۔ انھیں

سارے دن ایک ہی جگہ کھڑے رہنا منظور تھا۔ پر کانٹوں میں پیر رکھنے کی جرأت نہ تھی۔ چیں بہ چیں

ہو کر بولے۔ ”کیا بات ہوئی؟“

شاکرہ: ”کچھ نہیں۔ اپنی طبیعت۔ نہیں جی چاہتا نہیں رکھتے۔ کسی کے ہاتھوں پک تو نہیں گئے۔“

صابر: ”تمہیں بیٹھے بٹھائے ایک نہ ایک کچھ سوجھتی رہتی ہے۔“

شاکرہ: ”ہاں مجھے تو اس بات کا جنون ہے۔ کیا کروں؟ خصلت ہی ایسی ہے۔ تمہیں یہ بہت پیاری ہے۔ تو لیجا کر گلے باندھو! میرے یہاں ضرورت نہیں ہے۔“

دایہ گھر سے نکلی تو اس کی آنکھیں لبریز تھیں۔ دل نصیر کے لیے تڑپ رہا تھا کہ ایک بار بچے کو گود میں لے کر پیار کر لوں۔ پر یہ حسرت لیے اسے گھر سے نکلنا پڑا۔

نصیر دایہ کے پیچھے پیچھے دروازہ تک آیا لیکن جب دایہ نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تو مچل کر زمین پر لیٹ گیا۔ اور اٹا اٹا کہہ کر رونے لگا۔ شاکرہ نے چکارا پیار کیا۔ گود میں لینے کی کوشش کی۔ مٹھائی کا لالچ دیا۔ میلہ دکھانے کا وعدہ کیا۔ اس سے کام نہ چلا تو بندر اور سپاہی اور لُٹو اور ہوا کی دھمکی دی۔ مگر نصیر پر مطلق اثر نہ ہوا۔ یہاں تک کہ شاکرہ کو غصہ آ گیا۔ اس نے بچہ کو وہیں چھوڑ دیا۔ اور آکر گھر کے دھندوں میں مصروف ہو گئی۔ نصیر کا منہ اور گال لال ہو گئے۔ آنکھیں سوج گئیں۔ آخر وہ وہیں زمین پر سکتے سکتے سو گیا۔

شاکرہ نے سمجھا تھا تھوڑی دیر میں بچہ رو دھو کر چپ ہو جائے گا۔ پر نصیر نے جاگتے ہی پھر اٹا کی رٹ لگائی۔ تین بجے صابر حسین دفتر سے آئے اور بچے کی یہ حالت دیکھی تو بیوی کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر اسے گود میں اٹھالیا۔ اور بہلانے لگے۔ آخر نصیر کو جب یقین ہو گیا کہ دایہ مٹھائی لینے گئی تو اسے تسکین ہوئی۔ مگر شام ہوتے ہی اس نے پھر چیخنا شروع کیا۔ ”اٹا مٹھائی لائی؟“

اس طرح دو تین دن گزر گئے۔ نصیر کو اٹا کی رٹ لگانے اور رونے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ وہ بے ضرر کتا جو ایک لمحہ کے لیے اس کی گود سے جدا نہ ہوتا تھا۔ وہ بے زبان بلی جسے طاق پر بیٹھے دیکھ کر وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ وہ طائر بے پرواز جس پر وہ جان دیتا تھا۔ سب اس کی نظروں

سے گر گئے۔ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ اتنا جیسی جیتی جاگتی پیار کرنے والی، گود میں لے کر گھمانے والی، تھپک تھپک کرسلانے والی، گاکا کر خوش کرنے والی چیز کی جگہ ان بے جان، بے زبان چیزوں سے پُر نہ ہو سکتی تھی۔ وہ اکثر سوتے سوتے چونک پڑتا اور اتنا پکار کے رونے لگتا۔ کبھی دروازہ پر جاتا اور اتنا پکار کر ہاتھوں سے اشارہ کرتا۔ گویا اسے بلارہا ہے۔ اتنا کی خالی کوٹھری میں جا کر گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ اسے امید ہوتی تھی کہ اتنا یہاں آتی ہوگی۔ اس کوٹھری کا دروازہ بند پاتا تو جا کر کواڑ کھٹکھٹاتا کہ شاید اتنا اندر چھپی بیٹھی ہو۔ صدر دروازہ کھلتے سنتا تو اتنا کہہ کر دوڑتا۔ سمجھتا کہ اتنا آگئی۔ اس کا گد رایا ہوا بدن گھل گیا۔ گلاب کے سے رخسار سوکھ گئے۔ ماں اور باپ دونوں اس کی موہنی ہنسی کے لیے ترس ترس کر رہ جاتے۔ اگر بہت گد گدانے اور چھیڑنے سے ہنستا بھی تو ایسا معلوم ہوتا دل سے نہیں محض دل رکھنے کے لیے ہنس رہا ہے۔ اسے اب دودھ سے رغبت تھی نہ مصری سے، نہ میوہ سے، نہ بیٹھے بسکٹ سے، نہ تازی امرتوں سے۔ ان میں مزہ تھا جب اتنا اپنے ہاتھوں سے کھلاتی تھی۔ اب ان میں مزہ نہ تھا۔ دو سال کا ہونہار لہلہاتا ہوا شاداب پودا مرجھا کر رہ گیا۔ وہ لڑکا جسے گود میں اٹھاتے ہی نرمی، گرمی اور وزن کا احساس ہوتا تھا۔ اب استخوان کا ایک پُتلا رہ گیا تھا۔ شا کرہ بچہ کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی اور اپنی حماقت پر پچھتاتی۔ صابر حسین جو فطرتاً خلوت پسند آدمی تھے۔ اب نصیر کو گود سے جدا نہ کرتے تھے۔ اسے روز ہوا کھلانے جاتے، نت نئے کھلونے لاتے۔ پر مرجھایا ہوا پودا کسی طرح نہ پنپتا تھا۔ دایہ اس کی دنیا کا آفتاب تھی۔ اس قدرتی حرارت اور روشنی سے محروم ہو کر سبزہ کی بہار کیوں کر دکھاتا؟ دایہ کے بغیر اسے چاروں طرف اندھیرا، سناٹا نظر آتا تھا۔ دوسری اتنا تیسرے ہی دن رکھ لی تھی۔ پر نصیر اس کی صورت دیکھتے ہی منہ چھپا لیتا تھا۔ گویا وہ کوئی دیو نی یا بھتتی ہے۔

عالم وجود میں دایہ کو نہ دیکھ کر نصیر اب زیادہ تر عالم خیال میں رہتا۔ وہاں اس کی اپنی اتنا چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔ اس کی وہی گود تھی۔ وہی محبت، وہی پیاری باتیں، وہی پیارے پیارے گیت، وہی مزے دار مٹھائیاں، وہی سہانا سنسار، وہی دلکش لیل و نہار، اکیسے بیٹھے اتنا سے باتیں

کرتا۔ انا کتا بھونکے۔ انا گائے دودھ دیتی۔ انا اجلا اجلا گھوڑا دوڑتا۔ سویرا ہوتے ہی لوٹا لے کر دایہ کی کوٹھری میں جاتا اور کہتا۔ ”انا پانی پی۔“ دودھ کا گلاس لے کر اس کی کوٹھری میں رکھ آتا اور کہتا۔ ”انا دودھ پلا۔“ اپنی چار پائی پر تکیہ رکھ کر چادر سے ڈھانک دیتا اور کہتا۔ ”انا سوتی“ شا کرہ کھانے بیٹھتی تو رکابیاں اٹھا اٹھا انا کی کوٹھری میں لے جاتا اور کہتا ”انا کھانا کھائے گی“ انا اس کے لیے اب ایک آسانی وجود تھی جس کی واپسی کی اسے مطلق امید نہ تھی۔ وہ محض گزشتہ خوشیوں کی دلکش یادگار تھی جس کی یاد ہی اس کا سب کچھ تھی۔ نصیر کے انداز میں رفتہ رفتہ طفلانہ شوخی اور بیتابی کی جگہ ایک حسرت ناک توکل، ایک مایوسانہ خوشی نظر آنے لگی۔ اس طرح تین ہفتے گزر گئے۔ برسات کا موسم تھا۔ کبھی شدت کی گرمی، کبھی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے، بخار اور زکام کا زور تھا۔ نصیر کی نقاہت اس موسمی تغیرات کو برداشت نہ کر سکی۔ شا کرہ احتیاطاً اسے فلا لین کا کرتا پہنائے رکھتی۔ اسے پانی کے قریب نہ جانے دیتی۔ ننگے پاؤں ایک قدم نہ چلنے دیتی۔ مگر رطوبت کا اثر ہو ہی گیا۔ نصیر کھانسی اور بخار میں مبتلا ہو گیا۔

صبح کا وقت تھا۔ نصیر چار پائی پر آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ ڈاکٹروں کا علاج بے سود ہو رہا تھا۔ شا کرہ چار پائی پہنچھی اس کے سینے پر تیل کی مالش کر رہی تھی اور صابر حسین صورت غم بنے ہوئے بچہ کو پُر درد دنگا ہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس طرف وہ شا کرہ سے بہت کم بولتے تھے۔ انھیں اس سے ایک نفرت سی ہو گئی تھی۔ وہ نصیر کی اس بیماری کا سارا الزام اسی کے سر رکھتے تھے۔ وہ ان کی نگاہوں میں نہایت کم ظرف، سفلہ مزاج، بے حس عورت تھی۔

شا کرہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”آج بڑے حکیم صاحب کو بلا لیتے۔ شاید انھیں کی دوا سے فائدہ ہو۔“ صابر حسین نے کالی گھٹاؤں کی طرف دیکھ کر ٹرشی سے جواب دیا۔

”بڑے حکیم نہیں۔ لقمان بھی آئیں تو اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔“

شا کرہ: ”تو کیا اب کسی کی دوا ہی نہ ہوگی؟“

صابر: ”بس اس کی ایک ہی دوا ہے اور وہ نایاب ہے۔“

شا کرہ: ”تمہیں تو وہی دُھن سوار ہے۔ کیا عبا سی امرت پلا دے گی؟“

صابرہ: ”ہاں وہ تمہارے لیے چاہے زہر ہو۔ لیکن بچے کے لیے امرت ہی ہوگی۔“

شا کرہ: ”میں نہیں سمجھتی کہ اللہ کی مرضی میں اسے اتنا دخل ہے۔“

صابرہ: ”اگر نہیں سمجھتی ہو اور اب تک نہیں سمجھا تو روؤ گی۔ بچے سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔“

شا کرہ: ”چپ بھی رہو۔ کیسا شگون زبان سے نکالتے ہو اگر ایسی جلی کٹی سنانی ہیں تو یہاں سے چلے جاؤ۔“

صابرہ: ”ہاں تو میں جاتا ہوں۔ مگر یاد رکھو یہ خون تمہاری گردن پر ہوگا۔ اگر لڑکے کو پھر تندرست دیکھنا چاہتی ہو تو اس عبا سی کے پاس جاؤ۔ اس کی منت کرو۔ التجا کرو۔ تمہارے بچے کی جان اسی کے رحم و کرم پر منحصر ہے۔“

شا کرہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

صابرہ حسین نے پوچھا۔ ”کیا مرضی ہے۔ جاؤں، اسے تلاش کروں؟“

شا کرہ: ”تم کیوں جاؤ گے۔ میں خود چلی جاؤں گی۔“

صابرہ: ”نہیں معاف کرو۔ مجھے تمہارے اوپر اعتبار نہیں ہے۔ نہ جانے تمہارے منہ سے کیا نکل جائے کہ وہ اتنی بھی ہو تو نہ آئے۔“

شا کرہ نے شوہر کی طرف نگاہِ ملامت سے دیکھ کر کہا۔ ”ہاں اور کیا! مجھے اپنے بچے کی بیماری کا قلق تھوڑے ہی ہے۔ میں نے شرم کے مارے تم سے کہا نہیں لیکن میرے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ اگر مجھے دایہ کے مکان کا پتہ معلوم ہوتا تو میں اسے کب کی منالائی ہوتی۔ وہ مجھ سے کتنی ہی ناراض ہو لیکن نصیر سے اسے محبت تھی۔ میں آج ہی اس کے پاس جاؤں گی۔ اس کے قدموں کو آنسوؤں سے تر کر دوں گی۔ اور وہ جس طرح راضی ہوگی اسے راضی کروں گی۔“

شا کرہ نے بہت ضبط کر کے یہ باتیں کہیں۔ مگر اٹھ دے ہوئے آنسو اب نہ رک سکے۔

صابر حسین نے بیوی کی طرف ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا اور نادم ہو کر بولے۔ ”میں تمہارا جانا مناسب نہیں سمجھتا، خود ہی جاتا ہوں۔“

عبّاسی دنیا میں اکیلی تھی۔ کسی زمانے میں اس کا خاندان گلاب کا سرسبز شاداب درخت تھا۔ مگر رفتہ رفتہ خزاں نے سب پتیاں گرا دیں۔ بادِ حوادث نے درخت کو پامال کر دیا۔ اور اب یہی سوکھی ٹہنی ہرے بھرے درخت کی یادگار باقی تھی۔

مگر نصیر کو پا کر اس کی سوکھی ٹہنی میں جان سی پڑ گئی تھی۔ اس میں ہری ہری پتیاں نکل آئی تھیں۔ وہ زندگی جو اب تک خشک اور پامال تھی۔ اس میں پھر رنگ و بو کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اندھیرے بیاباں میں بھٹکے ہوئے مسافر کو شمع کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ اب اس کا جوئے حیات سنگ ریزوں سے نہ ٹکراتا تھا۔ وہ اب ایک گلزار کی آبیاری کرتا تھا۔ اب اس کی زندگی مہمل نہیں تھی۔ اس میں معنی پیدا ہو گئے تھے۔

عبّاسی نصیر کی بھولی بھولی باتوں پر نثار ہو گئی۔ مگر وہ اپنی محبت کو شکرہ سے چھپاتی تھی۔ اس لیے کہ ماں کے دل میں رشک نہ ہو۔ وہ نصیر کے لیے ماں سے چھپ کر مٹھائیاں لاتی اور اسے کھلا کر خوش ہوتی۔ وہ دن میں دو دو تین تین بار اسے ابٹن ملتی کہ بچے خوب پروان چڑھے۔ وہ اسے دوسروں کے سامنے کوئی چیز نہ کھلاتی کہ بچے کو نظر نہ لگ جائے۔ ہمیشہ دوسروں سے بچے کی کم خوری کا رونا رویا کرتی۔ اسے نظر بد سے بچانے کے لیے تعویذ اور گنڈے لاتی رہتی۔ یہ اس کی خالص مادرانہ محبت تھی۔ جس میں اپنے روحانی احتفاظ کے سوا اور کوئی غرض نہ تھی۔

اس گھر سے نکل کر آج عبّاسی کی وہ حالت ہو گئی جو تھیر میں یکا یک بجلیوں کے گل ہو جانے سے ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی صورت ناچ رہی تھی۔ کانوں میں وہی پیاری پیاری باتیں گونج رہی تھیں، اسے اپنا گھر پھاڑے کھاتا تھا۔ اس کا لکڑی میں دم گھٹا جاتا تھا۔

رات جوں توں کر کے کٹی۔ صبح کو وہ مکان میں جھاڑو دے رہی تھی۔ یکا یک تازے حلوے کی صدا سن کر بے اختیار باہر نکل آئی۔ معاً یاد آ گیا۔ آج حلوہ کون کھائے گا؟ آج گود میں بیٹھ کر

کون چپکے گا۔ وہ نغمہ مسرت سننے کے لیے، جو حلوہ کھاتے وقت نصیر کی آنکھوں سے، ہونٹوں سے، اور جسم کے ایک ایک عضو سے برستا تھا، عباسی کی روح تڑپ اٹھی۔ وہ بے قراری کے عالم میں گھر سے نکلی کہ چلوں۔ نصیر کو دیکھ آؤں، پر آدھے راستہ سے لوٹ گئی۔

نصیر عباسی کے دھیان سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں اترتا تھا۔ وہ سوتے سوتے چونک پڑتی۔ معلوم ہوتا نصیر ڈنڈے کا گھوڑا دبائے چلا آتا ہے۔ پڑوسنوں کے پاس جاتی تو نصیر ہی کا چرچا کرتی۔ اس کے گھر کوئی آتا تو نصیر ہی کا ذکر کرتی۔ نصیر اس کے دل اور جان میں بسا ہوا تھا۔ شاکرہ کی بے رخی اور بدسلوکی کے ملال کے لیے اس میں جگہ نہ تھی۔

وہ روز ارادہ کرتی کہ آج نصیر کو دیکھنے جاؤں گی۔ اس لیے بازار سے کھلونے اور مٹھائیاں لاتی۔ گھر سے چلتی۔ لیکن کبھی آدھے راستے سے لوٹ آتی۔ کبھی دو چار قدم سے آگے نہ بڑھا جاتا۔ کون منہ لے کر جاؤں؟ جو محبت کو فریب سمجھتا ہوا سے کون منہ دکھاؤں! کبھی سوچتی، کہیں نصیر مجھے نہ پہچانے تو! بچوں کی محبت کا اعتبار کیا؟ نئی دایہ سے رنج گیا ہو۔ یہ خیال اس کے پیروں میں زنجیر کا کام کر جاتا تھا۔

اس طرح دو ہفتے گزر گئے۔ عباسی کا دل ہر دم اچاٹ رہتا۔ جیسے اسے کوئی لمبا سفر درپیش ہو۔ گھر کی چیزیں جہاں کی تھیں پڑی رہیں۔ نہ کھانے کی فکر نہ کپڑے کی۔ بدنی ضروریات بھی خلاء دل کو پُر کرنے میں لگی ہوتی تھیں۔ اتفاق سے اسی اثنا میں حج کے دن آگئے۔ محلے میں کچھ لوگ حج کی تیاریاں کرنے لگے۔ عباسی کی حالت اس وقت پالتو چڑیا کی سی تھی۔ جو قفس سے نکل کر پھر کسی گوشہ کی تلاش میں ہو۔ اسے اپنے تئیں بھلا دینے کا یہ ایک بہانہ مل گیا۔ وہ آمادہ سفر ہو گئی۔

آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اور ہلکی ہلکی پھواریں پڑ رہی تھیں۔ دہلی اسٹیشن پر زائرین کا ہجوم تھا۔ کچھ گاڑیوں میں بیٹھے تھے۔ کچھ اپنے گھر والوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ چاروں طرف اک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ دنیا اس وقت بھی جانے والوں کے دامن پکڑے ہوئے تھی۔ کوئی بیوی سے تاکید کر رہا تھا۔ ”دھان کٹ جائے تو تالاب والے کھیت میں مٹر بودینا اور

باغ کے پاس گئے ہوں۔“ کوئی اپنے جوان لڑکے کو سمجھا رہا تھا۔ ”آسامیوں پر بقایا لگان کی نالاش کرنے میں دیر نہ کرنا اور دو روپیہ سیڑھ سودر ورجرا کر لینا۔“ ایک بوڑھے تاجر صاحب اپنے منیم سے کہہ رہے تھے۔ ”مال آنے میں دیر ہو تو خود چلے جائیے گا اور چلتو مال لیجیے گا ورنہ روپیہ بھنس جائے گا۔“ مگر خال خال ایسی صورتیں بھی نظر آتی تھیں جن پر مذہبی ارادت کا جلوہ تھا۔ وہ یا تو خاموش آسمان کی طرف تاکتی تھیں، یا نحوست خونی تھیں۔ عباسی بھی ایک گاڑی میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ ان بھلے آدمیوں کو اب بھی دنیا کی فکر نہیں چھوڑتی۔ وہی خرید و فروخت لین دین کے چرچے! نصیر اس وقت یہاں ہوتا تو بہت روتا۔ میری گود سے کسی طرح نہ اترتا۔ لوٹ کر ضرور اسے دیکھنے جاؤں گی۔ یا اللہ! کسی طرح گاڑی چلے۔ گرمی کے مارے کلیجہ بھٹنا جاتا ہے۔ اتنی گھٹا اٹدی ہوئی ہے۔ برسنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ معلوم نہیں یہ ریل والے کیوں دیر کر رہے ہیں؟ جھوٹ موٹ ادھر ادھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ چٹ پٹ گاڑی کھول دیں۔ مسافروں کی جان میں جان آئے۔ یکا یک اس نے صابر حسین کو بائیسکل لیے پلیٹ فارم پر آتے دیکھا۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور کپڑے تر تھے۔ وہ گاڑیوں میں جھانکنے لگے۔ عباسی محض یہ دکھانے کے لیے کہ میں بھی جج کرنے جا رہی ہوں، گاڑی سے باہر نکل آئی۔ صابر حسین اسے دیکھتے ہی لپک کر قریب آئے اور بولے۔ ”کیوں عباسی! تم بھی جج کو چلیں؟“

عباسی نے فخریہ انکسار سے کہا۔ ”ہاں! یہاں کیا کروں؟ زندگی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ معلوم نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں۔ خدا کے یہاں منہ دکھانے کے لیے بھی تو کوئی سامان چاہیے۔ نصیر میاں تو اچھی طرح ہیں؟“

صابر: ”اب تو تم جاری ہو۔ نصیر کا حال پوچھ کر کیا کروگی۔ اس کے لیے دعا کرتی رہنا۔“
عباسی کا سینہ دھڑکنے لگا۔ گھبرا کر بولی۔ ”کیا دشمنوں کی طبیعت اچھی نہیں ہے؟“
صابر: ”اس کی طبیعت تو اسی دن سے خراب ہے جس دن تم وہاں سے نکلیں۔ کوئی دو ہفتہ تک تو اتنا اتنا کی رٹ لگا تا رہا۔ اور اب ایک ہفتہ سے کھانسی اور بخار میں مبتلا ہے۔ ساری

دوائیں کر کے ہار گیا۔ کوئی نفع ہی نہیں ہوتا۔ میں نے ارادہ کیا تھا چل کر تمھاری منت سماجت کر کے لے چلوں۔ کیا جانے! تمھیں دیکھ کر اس کی طبیعت کچھ سنبھل جائے لیکن تمھارے گھر پر آیا تو معلوم ہوا کہ تم حج کرنے جا رہی ہو۔ اب کس منہ سے چلنے کو کہوں۔ تمھارے ساتھ سلوک ہی کون سا اچھا کیا تھا؟ کہ اتنی جرأت کر سکوں اور پھر کارِ ثواب میں رخنہ ڈالنے کا بھی خیال ہے۔ جاؤ! اس کا خدا حافظ ہے۔ حیات باقی ہے تو صحت ہو ہی جائے گی ورنہ مشیتِ ایزدی سے کیا چارہ؟“

عباسی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سامنے کی چیزیں تیرتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ دل پر ایک عجیب وحشت کا غلبہ ہوا۔ دل سے دعا نکلی۔ ”اللہ میری جان کے صدقے، میرے نصیر کا بال بریک نہ ہو۔“ رقت سے گلا بھر آیا۔ ”میں کیسی سنگ دل ہوں پیارا بچہ رو رو کر ہلکان ہو گیا اور میں اسے دیکھنے تک نہ گئی۔ شا کرہ بد مزاج سہی، بد زبان سہی۔ نصیر نے میرا کیا بگاڑا تھا؟ میں نے ماں کا بدلہ نصیر سے لیا۔ یا خدا میرا گناہ بخشو! پیارا نصیر میرے لیے ہڑک رہا ہے (اس خیال سے عباسی کا کلیچہ مسوس اٹھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے) مجھے کیا معلوم تھا کہ اسے مجھ سے اتنی محبت ہے۔ ورنہ شا کرہ کی جوتیاں کھاتی اور گھر سے قدم نہ نکالتی آہ! نہ معلوم! بچارے کی کیا حالت ہے؟ انداز وحشت سے بولی۔ ”دودھ تو پیتے ہیں نا؟“

صابر: ”تم دودھ پینے کو کہتی ہو۔ اس نے دودن سے آنکھیں تو کھولی نہیں۔“

عباسی: ”یا میرے اللہ! ارے اولیٰ اولیٰ! قلیٰ قلیٰ! بیٹا! آ کے میرا اسباب گاڑی سے اتار دے۔ اب مجھے حج کی نہیں سوجھتی۔ ہاں بیٹا! جلدی کر۔ میاں! دیکھیے کوئی کیہ ہو تو ٹھیک کر لیجیے۔“

کیہ روانہ ہوا۔ سامنے سڑک پر کئی بگھیاں کھڑی تھیں۔ گھوڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ عباسی بار بار جھنجھلاتی تھی اور کیہ بان سے کہتی تھی۔ ”بیٹا! جلدی کر میں تجھے کچھ زیادہ دے دوں گی۔“ راستہ میں مسافروں کی بھیڑ دیکھ کر اسے غصہ آتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا گھوڑے کے پر لگ

جاتے۔ لیکن جب صابر حسین کا مکان قریب آ گیا تو عباسی کا سینہ زور سے اُچھلنے لگا۔ سرتیور آ گیا۔ بار بار دل سے دعا نکلنے لگی۔ خدا کرے سب خیر و عافیت ہو۔

یکہ صابر حسین کی گلی میں داخل ہوا۔ دفعتاً عباسی کے کان میں کسی کے رونے کی آواز آئی۔ اس کا کلیجہ منھ کو آ گیا۔ سرتیور آ گیا۔ معلوم ہوا دریا میں ڈوبی جاتی ہو۔ جی چاہا یکہ سے کود پڑوں۔ مگر ذرا دیر میں معلوم ہوا کہ عورت میکے سے وداع ہو رہی ہے۔ تسکین ہوئی۔

آخر صابر حسین کا مکان آپہنچا۔ عباسی نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف تاکا۔ جیسے کوئی گھر سے بھاگا ہوا میٹیم لڑکا شام کو بھوکا پیاسا گھر آئے اور دروازے کی طرف سہی ہوئی نگاہ سے دیکھے کہ کوئی بیٹھا تو نہیں ہے۔ دروازہ پر ستاٹا چھایا ہوا تھا۔ باورچی بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ عباسی کو ذرا ڈھارس ہوئی۔ گھر میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ نئی دایہ بیٹھی پولس پکار رہی ہے۔ کلیجہ مضبوط ہوا۔ شاکرہ کے کمرے میں گئی تو اس کا دل گرمی کی دوپہری دھوپ کی طرح کانپ رہا تھا۔ شاکرہ نصیر کو گود میں لیے دروازے کی طرف ٹھٹھکی لگائے تاک رہی تھی۔ غم اور یاس کی زندہ تصویر۔

عباسی نے شاکرہ سے کچھ نہیں پوچھا۔ نصیر کو اس کی گود سے لے لیا اور اس کے منھ کی طرف چشم پر نرم سے دیکھ کر کہا۔ ”بیٹا! نصیر! آنکھیں کھولو۔“

نصیر نے آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحہ تک دایہ کو خاموش دیکھتا رہا۔ تب یکا یک دایہ کے گلے سے لپٹ گیا اور بولا۔ ”اتا آئی۔ اتا آئی۔“

نصیر کا زرد مڑجھایا ہوا چہرہ روشن ہو گیا۔ جیسے بجھتے ہوئے چراغ میں تیل پڑ جائے۔ ایسا معلوم ہوا گویا وہ کچھ بڑھ گیا ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ نصیر آنگن میں کھیل رہا تھا۔ صابر حسین نے آکر اسے گود میں اٹھالیا اور پیار کر کے بولے۔ ”تمھاری اتا کو مار کر بھگا دیں؟ نصیر نے منھ بنا کر کہا۔ ”نہیں روئے گی۔“

عباسی بولی ”کیوں بیٹا! مجھے تو تو نے کعبہ شریف نہ جانے دیا۔ میرے حج کا ثواب کون دے گا؟“

صابر حسین نے مسکرا کر کہا۔ ”تمہیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ہو گیا۔ اس حج کا نام حج اکبر ہے۔“

منشی پریم چند

مشق

لفظ و معنی

برداشت کرنے والا، نیک مزاج کا، رحم کرنے والا	:	حلیم
کسی چیز یا کسی بات کو غلط ٹھہرانا	:	تردید
آنسو بہانا	:	اشک ریزی
بحث، مباحثہ	:	مناظرہ
غصہ، بھڑک اٹھنا	:	اشتعال
ہنسی اڑانا	:	تضحیک
اعتراف کرنا	:	تعریض
بہت باریک، کم قیمت، چھچھورا	:	رکیک
بدبو، بساند	:	عفونت
جس سے کوئی نقصان نہ ہو	:	بے ضرر
ہڈی	:	استخوان

لیل	:	رات
نہار	:	دن
رطوبت	:	نمی، تری
قلق	:	افسوس
سگریزہ	:	کنکری
زار	:	زیارت کرنے والا
مشیت ایزدی	:	اللہ کی مرضی
کوزہ	:	مٹی کا پیالا
شائبہ	:	ہلکا سا نشان، لہذا ہلکا سا شبہ یا شک
خطاوارانہ	:	قصور کرنے والے کی طرح
احتفاظ	:	لطف اٹھانا، مزہ لینا

غور کرنے کی بات

- اس افسانے میں نئی پریم چند نے متوسط طبقے کے مسلم گھرانے کی روزمرہ زندگی کی عکاسی کی ہے۔
- افسانے کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف نے عورت کی 'میتا' کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔
- افسانے میں عورتوں اور بچوں کی نفسیات کو بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔
- مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ صرف مذہبی فرائض ادا کرنے سے ہی ثواب نہیں ملتا بلکہ انسانی حقوق کی ادائیگی بھی عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔
- اس افسانے میں پریم چند نے خدمتِ خلق کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ جس کا درجہ اور ثواب بعض حالات میں عبادت سے بھی بڑھ کر ہو جاتا ہے۔

- یہ افسانہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ غریب اور مجبور لوگوں کو کتنی نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ انسانی زندگی کا ایک اہم اور ضروری حصہ ہوتے ہیں۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. شاکرہ عباسی سے کیوں ناراض رہتی تھی؟
 2. نصیر کی بیماری کا کیا سبب تھا؟
 3. عباسی نے حج پر جانا کیوں ملتوی کر دیا تھا؟
 4. عباسی کی واپسی سے نصیر پر کیا اثر ہوا؟
 5. صابر حسین نے عباسی سے یہ کیوں کہا:
- ”تمہیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ہو گیا۔ اس حج کا نام حج اکبر ہے۔“

عملی کام

- افسانے کو غور سے پڑھیے۔
- ذیل میں دیے گئے محاوروں کے جملے بنائیے:
- خوشی سے پھولانہ سمانا، آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا، کانٹوں میں پیر رکھنا، گلے کا ہار ہونا، طبیعت سیر ہونا
- افسانے کا مرکزی خیال بتائیے۔
- درج ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے:
- نفرت، سستا، ہوش، محبت، مہنگا، خوش، رونا، شیریں، ہنسی
- اس افسانے کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔